خطوطِ غالب

فنی تجزیہ

حامدہ مسعود

تقسیم کار
ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ

rekhta

ارائی اپنائی ہے جو سرور اور محسن دہلوی کی تحریروں کی خصوصیت ہے۔

اردو نثر کا جہاں تک تعلق ہے غالب نے چند تقریظیں، دیباچے اور تین رسالے لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامۂ غالب (جو برہان قاطع کے حامیوں کے جواب میں لکھے گئے تھے) تحریر کیے اس کے علاوہ چند اجزا ایک ناتمام قصہ کے ملتے ہیں جو مرنے سے چند دن پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن غالب کے جس رنگ نے حیات دوام پائی وہ ان کے اردو خطوط کا اسلوب ہے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۶۲۵ تقریظ بر گلزار سرور

۲۔ دیباچہ دیوان حزیں ص ۶۳۹ (خطوط غالب مہر)

۳۔ بحوالہ یادگار غالب حالی

جو انھوں نے اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کو لکھے ہیں۔ غالب کو فارسی سے طبعی مناسبت تھی۔ انھوں نے اپنے فارسی کلام کو نقش ہائے رنگ رنگ کہا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنے مجموعہ اردو کو بے رنگ قرار دیتے ہیں۔ لیکن زمانے کی تنقیدی میزان نے زبان اردو کی ادبی کاوش کو شہرت دوام عطا کی۔ حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ انھوں نے تفنن طبع کے طور پر اردو میں شاعری شروع کی تھی۔ اسی طرح فارسی نثر کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ (غالب) ۱۸۵۰ء تک فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے لیکن جب بہادر شاہ ظفر نے انھیں تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیا تو وہ فارسی میں محنت و مشقت برداشت کرنے کے لائق نہیں رہے۔ چنانچہ آسانی کی خاطر اردو میں خطوط لکھنے لگے۔ لیکن بعد کو ۱۸۴۸ء تک کے خطوط دستیاب ہونے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل بھی اردو میں خطوط لکھتے رہے ہیں۔ اس زمانہ میں اردو بے تکلف گفتگو کی زبان بن چکی تھی لہذا وقت کے تقاضے کے باعث جب وہ فارسی خطوط پر خاطر خواہ محنت اور توجہ صرف کرنے سے مجبور ہو گئے تو انھوں نے اردو میں خطوط نویسی شروع کی۔ میر غلام حسین قدر بلگرامی کو بڑے پردرد انداز میں بتاتے ہیں:

> بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے اب جسم میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف۔ اردو سو اس میں عبارت آرائی یک قلم متروک جو زبان پر آوے اور قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر۔ کیا لکھوں؟ اور کیا کہوں؟ [1]

---

[1] خطوط غالب مہر ص ۴۹۳

اسی طرح عبدالرزاق شاکر کو بھی اردو میں خطوط نگاری کی اسی قسم کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

> بندہ نواز، فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے .... کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں [1]

بڑھاپے نے فارسی انشا پردازی کے خاص معیار کو برقرار رکھنے میں ساتھ نہیں دیا تو وہ اردو نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن دوسری توجیہ یوں کی جا سکتی ہے کہ فن شاعری میں آئینہ وزن و صورت معنی نمودن کے بعد ان کا تخلیقی جوہر نثر کی طرف مائل ہوا۔ جہاں فطری اور بے تکلف اظہار گویا ان کا منتظر تھا۔ پختگی کے اس دور میں اردو سے یہ رغبت بغاوت اور ندرت پسندی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ اسلوب عام روش کے خلاف ایک فطری صحت مند رد عمل کا درجہ رکھتا ہے۔

غالب کی ادبی تخلیقی قوت جب فارسی کی شیوہ بیانی سے گریز کر کے اردو نثر کو ابلاغ کا ذریعہ بناتی ہے تو وہ اپنی انفرادیت سے اسے ایک جاندار اسلوب عطا کرتی ہے۔ ان کا یہ انداز تحریر اپنے زمانے کے مرصع اور سادہ اسالیب نثر سے کسی قدر مشابہت رکھنے کے باوجود ایک نیا اسلوب تھا۔ جس میں فن کار کے جذبے اور ذہن کی شرکت نے اسے ایک نیا رنگ دیا۔ اپنی شاعری کے ضمن میں غالب کو برابر زمانے سے یہ گلہ رہا کہ انھیں شعر کی معنویت اور حسن بیان کی خاطر خواہ داد نہیں مل سکی۔ لیکن اردو نثر کے سلسلے میں معاملہ

---

[1] خطوطِ غالب مہر ص ۵۲۹

برعکس نظر آتا ہے جس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہوتا ہے جو منشی شیو نرائن آرام کے نام ہے

> "اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے تعلقات اوروں پر ظاہر ہوں خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلافِ طبع ہے۔ ۱۹ نومبر ۱۸۵۸ء[1]

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام اس زمانے کے ایک خط میں بھی اس امر پر زور دیا ہے

> رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء[2]

اس میں شک نہیں کہ ابتداً غالب نے ان سرسری تحریروں کی اشاعت کو اپنی سخنوری کے شکوہ کے منافی سمجھا۔ ان کی رائے میں وہ باتیں جو بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ دوستوں کو مخاطب کرکے کی گئی ہیں دوسروں پر ظاہر نہیں ہونی چاہییں کہ یہ اقدام مصلحت کے سراسر خلاف ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ درپردہ انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ یہ خطوط اپنے انفرادی اسلوب کی وجہ سے اردو نثر میں ناقابلِ فراموش اہمیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مصلحت کو نظرانداز کرتے ہوئے خطوط کے نفسِ مضمون کو عام کرنے کی اجازت دیدی۔ اور اس کے بعد ان کی اشاعت کے سلسلہ میں انھوں نے ذاتی دلچسپی کا بھی اظہار کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں وہ علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:

> "مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب

میرے مسودات اردو کے جمع کرنے اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا وہاں بھیج دیا یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر اُن کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اور اس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔" [۱]

علائی کے جواب سے شش و پنج کا اظہار ہوتا ہے تو انھیں مکرر لکھتے ہیں۔

میرے اردو خطوط کے ارسال کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا تمہارے حسنِ طبع پر اس سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزا ہوا .... سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہے اور شہرت تمہارے منافی طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا۔ اور اگر ان کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ، چاہو بسبیل پارسل ارسال کرو" [۲]

۲۷ر اکتوبر ۱۸۶۸ء ’عودِ ہندی‘ مجموعۂ مکاتیبِ غالب کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ جس کے چار ماہ بعد مکتوب نگار دنیا سے رخصت ہو گیا۔ تاہم اس کی زندگی میں ان ہی خطوط کی اشاعت ایک ایسی روایت کی بنیاد ڈالتی ہے جو روشن خیالی اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ یہ خطوط اپنے لکھنے والے کی ذہنی تصاویر کو تمام و کمال پیش کرتے ہیں۔ خیریت طلبی

---

[۱] خطوطِ غالب مہر ۹۳

[۲] خطوطِ غالب مہر ۹۳

اور خیریت رسانی کی رسمیات سے قطع نظر ان میں مکتوب نگار نے اپنے ادبی عقائد، عصری حقائق اور ذاتی زندگی کی سرگزشت بیان کی ہے اور انسانی دردمندی کے تحت اپنے مخاطب کی زندگی کے معاملات سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں عام کاروباری معاملات بھی ہیں اور نظریۂ شعر سے متعلق باریک اصولوں پر عالمانہ مباحث بھی۔ کہیں اپنی ذات پر بھرپور اعتماد کا اظہار ہوتا ہے تو کہیں بخت کی نارسائی پر حزن و تاسف کی گہری لکیریں ہویدا ہیں۔

ان خطوط میں وہ اپنے دور کے کوائف و احوال غیر جذباتی انداز کے ساتھ تفصیل سے قلم بند کرتے ہیں تو دوسری طرف دلی کی شاندار تہذیب کی نشانیوں کے مٹنے اور مقتدر شخصیتوں کی عبرتناک حال و گیر پر کف افسوس ملتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں نجی زندگی کی بھی روداد بیان کی ہے اور اپنی شراب نوشی اور تنگ دستی کا پورا احوال بغیر کسی حزم و احتیاط کے سنایا ہے۔ ایسے خطوط کی اشاعت کی اجازت وہی شخص دے سکتا ہے جس کا اعتقاد ہو کہ انسانی سیرت کے تانے بانے نور و ظلمت کے تاروں سے گندھے ہوئے ہیں اور انسان کو صرف فرشتہ یا صرف شیطان سمجھ کر اس کی سیرت کا محاکمہ کرنا اپنی کم نگہی کی دلیل ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت غالب عوام و خواص کے روبرو اپنی ذات کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنا تقاضائے بشریت سمجھتے ہیں۔

اگر خطوط غالب کی غیر معمولی اہمیت پر ایک جملہ میں تبصرہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک حقیقی فن کار کی وہ دانش و بینش عکس ریز ہے جو پختگی کی عمر کا حاصل سمجھی جاتی ہے۔ زندہ اسلوب کی اپنی آواز ہوتی ہے۔ جیسے ہی ہم خطوط غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس آواز کو سنتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم شروع سے اس آواز کی شناخت کرتے چلیں[۳] تاکہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو۔

غالب کے یہاں تحریر زبانی گفتگو کے قائم مقام ہے۔ وہ خط کو رقعہ، داستان، کہانی اور خبرنامے کے مترادف قرار دیتے ہیں

- آج یہ رقعہ تمکو لکھتا ہوں۔
- میرا رقعہ تمھارے نام کا اور تفتہ کا رقعہ تمھارے نام کا حسب الحکم تمھارے واپس بھیجا جاتا ہے۔
- تم جو مولانا علائی کو خط لکھو تو یہ رقعہ ملفوف کرو۔
- یہ جو رقعے لے کر پہونچتے ہیں ان کا نام حسن علی ہے۔

قطعی طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ رقعہ کا لفظ انھوں نے عام کاروباری یا مختصر خطوط کے لیے استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ مرزا یوسف کے نام ۲۶ جولائی ۱۸۵۹ء کو جو مفصل خط لکھتے ہیں اس میں یہ لفظ موجود ہے۔

> حسین مرزا صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ رقعہ پڑھا دینا۔

تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا غالب نے اپنے خطوط میں لفظ رقعہ کا استعمال تقریباً ترک کر دیا اور پھر اس لفظ کے بجائے دوسری اصطلاحات مثلاً خبر، کہانی اور داستان خط کے مفہوم کو وسیع تر حدود میں داخل کرتی ہیں۔ چنانچہ مکتوب نگار منشی ہرگوپال تفتہ کو اطلاع دیتا ہے۔

> صاحب، ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تمکو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔[1]

میر مہدی مجروح کے نام

> "میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو ادھر آؤ خبریں سنو۔[2]

علاءالدین علائی کے نام ان کا ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

> صاحب، میری داستان سنیئے۔[3]

---

[1] خطوط غالب مہر ص ۱۷۵

[2] خطوط غالب مہر ص ۲۸۷

[3] خطوط غالب مہر ص ۵۸

اور انہی کے نام ایک دوسرے خط میں بھی مکتوب کو کہانی کا قائم مقام قرار دیا ہے :

> میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سن۔ میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں ۔[۱]

اس کے علاوہ متعدد خطوط میں بھی یہی سننے اور سنانے کا انداز ملتا ہے۔ اس ذیل میں مرزا تفتہ کے نام خطوط خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً

> آؤ مرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سنو۔[۲]

یا

> سنو میاں، میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ [۳]

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔

> بھائی، میرا ذکر سنو ۔[۴]

اسی طرح میر مہدی مجروح کے نام خطوط میں بھی اس طرح کے جملے اکثر ملتے ہیں۔

> سنو اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔ [۵]

یا

> میری جان، سنو داستان ۔[۶]

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے یہاں خط صرف خیر و عافیت کی رسم کو نبھانے کے لیے نہیں لکھے گئے بلکہ یہ مکتوب نگار کی اس آرزو کی تکمیل ہے کہ وہ مخاطب کو مکتوب نگار

rekhta

کی زندگی کے احوالِ واقعی کا محرم بنائے تاکہ لطف و انبساط کی کیفیت جو اس تحریر کا حاصل ہے، دونوں ہستیوں کو اپنے حصار میں لے لے۔

خطوط کے اِن مماثل مفاہیم و معانی سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ نامہ نگاری غالب کے لیے ایک نفسیاتی ضرورت بن چکی تھی۔ خاص طور سے غدر ۵۷ء کے بعد شہر دلی سیاسی انتشار، اقتصادی ابتری اور عام سماجی افراتفری کے نرغے میں تھا اور غالب اپنے ہی شہر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے پر مجبور تھے تو انھیں خطوط میں اپنی تنہائی کا نعم البدل نظر آیا۔ دوست و احباب کہاں سے میسر آتے جبکہ شہر کی فضا اپنے حال و مستقبل کے بارے میں بے یقینی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گرفتاریاں اور خانہ تلاشیاں بڑے پیمانہ پر جاری تھیں غدر کے فرو ہو جانے کے بعد عرصہ تک عوام و خواص آزادی کے ساتھ شہر دلی میں نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس عالمِ تنہائی کا مداوا انھوں نے خطوط میں جس طرح چاہا وہ کچھ یوں ہے۔

> بھائی، مجھکو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے[1] مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

> کیوں صاحب، مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو

---

[1] ۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے کہ اس پُرآشوب زمانے میں ان کی اور ان کے خاندان کی زندگیوں کا محفوظ رہنا اسی حفاظتی دستہ کی بدولت ممکن ہوا جو مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں کی حفاظت کے لیے مامور کیا تھا۔ خطوط غالب مہر، ص ۲۶۲

> کہ کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار لوگ نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنو اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خط کی موقوف صرف تم تین صاحبوں[1] کے آنے کی توقع اس میں دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔[2]

داستان کہانی اور خبر نامے ہونے کے ساتھ ساتھ غالب کے خطوط مطلب نویسی اور اظہارِ معنی کا جاندار مرقع ہیں۔ ان کی جدت پسند اور تنوع پرور طبیعت کو آرائشی عبارت آرائی سے گراں بار روایتی انداز گوارہ نہ تھا۔ چنانچہ قاضی عبدالجمیل جنون کے نام ایک خط میں اس طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

> میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں۔[3]

مگر یہ مطلب نویسی مجرد اور سپاٹ نہیں ہے بلکہ اس میں گفتگو کی بے ساختگی اور کشش انگیزی ایک غالب عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔ مروجہ متصدیانہ اور منشیانہ مراسلہ نگاری سے گریز کر کے انھوں نے اپنی ڈگر اسی طرح نکالی جس طرح عرصہ ہوا شاعری کے میدان میں وہ انفرادی امتیاز قائم کر چکے تھے۔ مراسلے کو مکالماتی انداز میں ڈھالنا ایک فن ہے جسے انھوں نے

---

[1] مراد منشی نبی بخش حقیر، مولوی قمر الدین خاں اور تفتہ۔

[2] خطوطِ غالب۔ مہر ص ۱۵۱ [3] خطوط غالب مہر ص ۵۱۲

بے تکلفی کے ساتھ برتا۔ چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کے خط میں دعویٰ کرتے ہیں۔

> میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ [۱]

ایک دوسری جگہ نواب انور الدولہ شفق کے نام مکتوب میں اسی طرف یوں اشارہ ہوتا ہے

> اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ کر کر کہار کو دیتا ہوں کہ ڈاک میں دے آوے۔ [۲]

اس طرزِ تحریر کے متعلق شفق ہی کے نام ایک دوسرے خط میں واضح تر بیان موجود ہے

> یہ خط لکھنا نہیں ہے۔ باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔ [۳]

غالب کو تحریر میں تقریر کا انداز محبوب تھا۔ اس طرزِ نگارش کو نہ صرف انھوں نے اپنے خطوط میں اپنایا بلکہ وہ متواتر اس کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ مرزا تفتہ کی تحریر کی ان الفاظ میں تحسین کی ہے۔

> زیادہ خوشی کا سبب یہ ہے کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرداز دے دیا تھا۔ [۴]

غالب کی جدت پسندی اور مکالمہ طرازی دوسرے لوگوں کے خطوط میں بھی یہی وصف دیکھنے کی خواہشمند ہے۔ چنانچہ وہ مرزا حاتم علی مہر کی رسمی خط و کتابت پر شوخی اور اور استہزا کے ملے جلے انداز میں یوں گرفت کرتے ہیں:

> اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ رقعات عالمگیری یا انشائے[1] خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اس میں پسند آ جایا کرے وہ خط میں لکھ لیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمہارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔ [2]

ان چند جملوں میں بے معنی لفاظی اور بے جان تحریر کے خلاف غالب کا ردعمل ظاہر ہوتا ہے۔ خطوط نویسی کے روایتی انداز کو ترک کر کے مکتوب نگار نے اپنے ذوق لطیف سے جو مخصوص انداز اختیار کیا ہے وہ اس کی اہمیت سمجھتا ہے۔ میر مہدی مجروح کو غالب کے خط میں کچھ کمی نظر آتی ہے تو ان کو شکوہ سنجی کے جواب میں نہایت اعتماد کے ساتھ قائل کیا جاتا ہے۔

> تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو۔ مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے

---

[1] ہندوستان میں فارسی زبان عرصہ دراز تک تہذیب و ثقافت پر چھائی رہی۔ اس لیے فارسی مکتوب نگاری کے اسلوب کو ذوق و شوق کے ساتھ اپنایا گیا۔ امیر خسرو کے "اعجاز خسروی" کو ترسل کا ممتاز ہدایت نامہ قرار دیا جاتا ہے ابوالفضل کے خطوط میں رنگینی کے بجائے ایک قسم کی سنجیدگی کا رجحان ملتا ہے اس کے علاوہ ہندوستانی فارسی میں متعدد خطوط نویسی کے نمونے ملتے ہیں جن میں سے دو (رقعات عالمگیری اور انشائے خلیفہ) کا ذکر غالب نے اس خط میں کیا ہے۔ خطوط نویسی کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں "مگر تہذیب میں تکلف کا رنگ جتنا جتنا بڑھتا گیا اسی قدر خطوط میں بھی تکلف اور رنگینی کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ طویل سرنامے لمبے لقاب و آداب، طرز تخاطب میں بناوٹ اور تصنع اور "دفتریت" کے انداز نمایاں ہوتے گئے جن کا خاتمہ اس سلوب پر ہوا جس کو غالب نے "محمد شاہی روشوں" کا نام دیا ہے [میر امن سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صفحہ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔]

[2] خطوط غالب مہر ص ۲۲۴۔ ۲۲۵۔

> وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہونچا۔ جی خوش ہوا ...... کیوں سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے۔ خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں ...... اگر تمہاری خوشنودی اس طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ [1]

غالب کو اپنے خطوط کی انفرادیت کا پورا احساس تھا۔ جب انھوں نے جنون کو دامغ کیا تھا کہ وہ بندھے ٹکے اصولوں کے مقابلے میں مطلب نویسی کو اولیت دیتے ہیں تو گویا وہ اس کے اسلوب کو زیادہ وقیع اور جاندار بنانے کے حق میں تھے۔ ان کی بلند قامت شخصیت اپنے خطوط کی مقبولیت پر انبساط اور افتخار کے اظہار میں مضائقہ نہیں سمجھتی۔ میر مہدی مجروح کے خط میں، مکتوب نگار نے اپنے اور میران صاحب کے درمیان جو مکالمہ ترتیب دیا ہے اس کے آخری حصہ میں یہ احساس موجود ہے۔

> کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جاوے۔ میں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے خط بھیجیے گا۔ [2]

مکتوب نگار کی فکری شادابی خط کو نئے اسلوب کے سانچے میں ڈھال کر اسے فن کا ایک نادر نمونہ بنا دیتی ہے۔ اس کی مخصوص فطرت جس نے اسے عنفوان شباب اور اس کے بعد

---

[1] خطوط غالب - مہر ص ۳۰۰ ۔

[2] خطوط غالب مہر ص ۲۹۵

کے دور میں شاہراہِ عام پر چلنے کے بجائے اپنی راہ بذاتِ خود تعمیر کرنے پر اکسایا تھا۔ اس نثری اسلوب میں بھی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ہم سب سے پہلے القاب و آداب کو لیتے ہیں۔

غالب نے ایک خط میں تذکرہ کیا ہے کہ وہ القاب و آداب نہیں لکھتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے فرسودہ القاب و آداب سے گریز کیا تھا جو اس زمانے میں صرف اس لیے ہر خط کے آغاز میں لکھے جاتے تھے کہ انشا پرداز انھیں لازم قرار دیتے تھے۔ غالب نے اس رسم کو ہنرمندی کے ساتھ برت کر اس میں بے تکلفی اور اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے بہت سے خطوط بغیر القاب کے براہِ راست گفتگو کے انداز میں شروع ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے قدیم القاب و آداب کو یکسر رد نہیں کیا بلکہ تھوڑی ترمیم و تنسیخ کے بعد ان کو بھی اپنے خطوط میں استعمال کیا ہے۔ دراصل مکتوب الیہ کی شخصیت انھیں تصور میں اپنے لیے ایک مخصوص خطاب فراہم کرنے پر اکساتی ہے۔ چنانچہ یہ القاب بھی حفظِ مراتب کے لحاظ سے وضع ہوتے ہیں اور کبھی کسی صورتِ حال کے تاثر کے نتیجے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر و بیشتر یہ طرزِ تخاطب مکتوب نگار کے دلی لگاؤ کا بے ساختہ اظہار بن کر خط کی فضا کو منور کر دیتا ہے۔ جن ہستیوں کا احترام مقصود ہے انھیں پیر و مرشد قبلۂ حاجات، خداوندِ نعمت کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ مثلاً صاحب عالم مارہروی کے لیے دو خطوط میں عقیدت مندانہ عجز کے ساتھ یہ القاب وضع ہوئے ہیں

> حضرت صاحب قبلہ و کعبہ جناب صاحب عالم کو فقیر اسد اللہ
> کی بندگی۔

یا

> بعد حمد خدا و نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے قبلۂ
> روح و رواں جناب صاحب عالم کو بندگی

نواب میر غلام بابا خاں کے لیے دو القاب یوں ہیں۔

ستودہ بہر زباں و نامور بہر دریا نواب صاحب شفیق کرم گستر
مرتضوی تبار، نواب میر غلام بابا خاں بہادر عالی شان والا دودماں
زاد مجدکم۔

میر حبیب اللہ ذکا جو مکتوب نگار سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ انھیں اس طرح مخاطب کیا ہے۔

اے عنایت بہ عنایت ہمشکل
میرے مشفق میرے شفیق مجھ سے ہیچ پوچ کے ماننے والے مجھ سے
بُرے کو اچھا جاننے والے میرے محب میرے محبوب۔
دوست روحانی و برادر ایمانی۔
جاناں بلکہ جاں

بے تکلف احباب اور شاگردوں کے لیے جن سے انھیں دلی تعلق ہے کبھی سرے سے القاب نہیں ہوتا اور کبھی میاں، برخوردار بھائی صاحب سید صاحب، مرزا، کیوں صاحب وغیرہ طرح طرح کے القاب ایجاد کرتے ہیں۔ مثلاً۔

علاء الدین خاں علائی کے لیے

میری جان، جان غالب کے علاوہ یار بھتیجے گویا بھائی۔ مولانا علائی
اقبال نشاں۔ جانا عالی نشانا۔ جان غالب۔ جانا جانا!

اپنے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے لیے

مہاراج۔ جان من و جانانِ من۔ دیکھو صاحب۔ اجی مرزا تفتہ
منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں منشی ہرگوپال تفتہ۔ میرے
مہربان۔ مرزا تفتہ سخندان۔

ایک جگہ تفتہ کو شغل مے نوشی کی وجہ سے ازخود رفتہ مرزا تفتہ بطور تفنن طبع کہا ہے اور کبھی نور نظر لخت جگر کہہ کر شفقت کا احساس جگایا ہے۔ جب مکتوب الیہ کے لیے جوش محبت فزوں ہوتا ہے تو ـــــ کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ یعنی میرزا تفتہ کا خطاب رونمائی کرتا ہے۔

میر مہدی مجروح کو خط لکھنے بیٹھتے ہیں تو مختصر اور طویل دونوں طرح کے القاب استعمال کرتے ہیں۔ یعنی :ـــــ سید صاحب میاں، سید، بھائی میاں لڑکے کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔

اور کبھی خوبیٔ دین و دنیا، مار ڈالا یار برخوردار کامگار میر مہدی، کیوں کیوں یار کیا کہتے ہو، میاں لڑکے آہا ہا، اور میاں سید زادہ آزادہ ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو؟ ـــــ جیسے طویل تر خطاب ایجاد کرتے ہیں۔ اسی طرح منشی شیو نرائن آرام کو کبھی برخوردار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو کبھی میاں کے لقب سے سرفراز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نور نظر لخت جگر، مہاراج یا صاحب کہہ کر بھی پکارتے ہیں منشی شیو نرائن آرام کے نام ایک خط یوں شروع ہوتا ہے

شفیق میرے مکرم میرے شیو نرائن صاحب

تم ہزاروں برس سلامت رہو۔

یہاں صرف دعا ہی نہیں بلکہ میرے شفیق اور میرے مکرم کے بجائے شفیق میرے اور مکرم میرے کی ترکیب نے اپنائیت کا ایک دوسرا ہی لہجہ اختیار کر لیا ہے۔ بے تکلفی کی لہر واہ حضرت بھائی صاحب کے سیدھے سادے القاب میں داخل ہو کر اس میں اپنائیت پیدا کرتی ہے۔ لیکن غالب اس سادگی میں بھی کسی ایک طرز کے پابند نہیں رہتے۔ وہ معرب، مفرس اور قدیم القاب بھی اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں اجنبیت کی بو باقی نہیں رہتی۔

مثلاً   قرۃ العین میر غلام حسنین سلمہ اللہ تعالیٰ

یا میر مہدی کے لیے   برخوردار کامگار میر مہدی دہلوی۔

یا علائی کے واسطے   نیر اصغر سپہر سخن دانی، ـــــ کے القاب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اسی ذیل میں یہ امر لائق توجہ ہے کہ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان ریاست رامپور کے نام خطوط اس القاب سے شروع ہوتے ہیں

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت

البتہ دو خطوط میں صرف جناب عالی اور ایک میں خداوند نعمت استعمال ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں حفظ مراتب کا لحاظ اور حاجت روائی مقصود ہے جس کی وجہ سے یہ خطوط کاروباری اور استمدادی نوعیت کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس مجبوری کے باوجود غالب کا یہ طرز تخاطب زمانے کے رواج اور مطالبہ کے مقابلہ میں زیادہ راست اور تصنع سے پاک ہے نوابین کے تخاطب کا یہ تضاد سماجی حقیقت کا مظہر ہے

بے تکلفی کے علاوہ غالب کے القاب میں مخاطب کے ذہنی اور علمی معیار کا لحاظ بھی مدنظر رہتا ہے۔ اس ضمن میں غالب نے والیان رام پور اور نواب انورالدولہ شفق کے نام جو مکتوبات تحریر کیے ہیں، ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

غالب نے مرزا حاتم علی بیگ، مہر کو ایک خط میں لکھا تھا۔

مرزا صاحب،

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو [1]

---

[1] ۔ خطوط غالب مہر ص ۲۱۹